میر خلیل الرحمٰن کا صحافیانہ مزاج: چند یادیں

[صدر شعبہ ابلاغیات عامہ جامعہ کراچی پروفیسر ڈاکٹر طاہر مسعود کا یہ مضمون روزنامہ جنگ کے مزاج اس کی تاریخ، رویے اسلوب اور طریقے پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ شام کے روزنامہ جنگ سے صبح کے روزنامہ جنگ اور دی نیوز سے جؤ تک جنگ گروپ کے کاروباری سفر کی تمام کہانیاں اور ان کہانیوں کا نقطہ عروج اس مختصر مضمون میں مستور ہیں سرمایہ دارانہ مزاج رکھنے والا اخبار سرمایہ دارانہ طور طریقوں سے اپنے کاروبار کو وسعت دیتا ہے جس میں ارتکاز سرمایہ قدر زریں ہوتی ہے اس قدر کے قدر دان اخباری صحافت میں اور بھی ہیں لیکن اس صنف سخن میں جنگ کو ایک خاص مقام اور اعزاز حاصل ہے۔ حدود کے ذریعے اسلام کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے پس پشت کیا مقاصد تھے ان مقاصد کی جھلک ڈاکٹر طاہر مسعود کے مضمون کی سطر سطر سے نمایاں ہے لیکن ہمارے علماء کرام اور دینی مفکرین اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کاروبار کو وسعت دینے والے کا ''کلمہ بہ ظاہر حق لیکن مقصد ہر حال میں باطل ہوتا ہے'' اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا سرمایہ دارانہ نظام کے بغیر اخبارات اور ٹیلی ویژن ایک دن بھی زندہ رہ سکتے ہیں سرمایہ دارانہ نظام جس دن ختم ہوگا یہ دونوں ادارے اسی لمحے تہس نہس ہو جائیں گے یہ دونوں سرمایہ داری کے خاص خادم ہیں اسی لیے اخبارات صنعت بن چکے ہیں اور صنعت کا تعلق صرف منافع سے ہے یہی واحد اصول ہے]۔

روزنامہ ''جنگ'' کو اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بنانے والے میر خلیل الرحمٰن نے جنھیں بالعموم میر صاحب کہا جاتا ہے، ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ''ایک نہ ایک دن آپ میرے بارے میں ضرور لکھیں گے''۔ ان کی بات سن کر میں خاموش رہا تھا لیکن میں نے دل میں کہا تھا: ''یقیناً میر صاحب! آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی'' آج وہ وقت آ گیا ہے کہ میں میر صاحب کی خواہش یا پیش گوئی، آپ اسے کوئی

بھی نام دیں، اسے پورا کروں اور میں نے انھیں جیسا دیکھا اور جیسا پایا تھا، بغیر کسی مصلحت و مبالغے کے بیان کردوں۔ اس لیے کہ میر صاحب کوئی چھوٹے یا معمولی آدمی نہیں تھے۔ ان کا شمار اردو صحافت کے ان مشاہیر میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو اخبار نویسی کا مزاج و منہاج بدل کر رکھ دیا۔ ان کی لائی ہوئی تبدیلیاں مثبت تھیں یا منفی، تعمیری تھیں یا تخریبی، اس بارے میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ ''جنگ'' اخبار نے پچھلی نصف صدی میں اس قوم کو کیا دیا ہے؟ بلکہ اس قوم کو کیا بنا دیا ہے۔ ''جنگ'' کے بعد ''جیو'' اسی کا تسلسل ہے۔ بیٹوں [جاوید و شکیل] نے باپ کی موت سے کوئی خلاء پیدا نہیں ہونے دیا۔ سرکار کی مدح سرائی پہلے بھی جاری تھی، اب بھی جاری ہے۔ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ پچھلے تقریباً دو سو سال میں اردو میں جو اخبارات نکلے ہیں، ان میں ایک آدھ اخبار کو چھوڑ کر ہر دور کا کثیر الاشاعت اخبار سرکار کا مدح خواں رہا ہے۔ خواہ وہ کوہ نور، لاہور ہو، منشی نول کشور کا اودھ اخبار ہو، منشی محبوب عالم کا پیسہ اخبار ہو یا میر صاحب کا ''جنگ'' اخبار ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے اخبارات خدمت قوم کے جذبے سے زیادہ کاروباری اغراض و مقاصد کے تحت نکالے گئے تھے اور ان کو کامیاب بنانے کے لیے کاروباری ہتھکنڈے اختیار کیے گئے چنانچہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ لیکن تاریخ کا انتقام یہ ہے کہ جو عزت و وقار، جو احترام اور قدر و منزلت آج بھی دلوں میں مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار''، مولانا محمد علی کے ''کامریڈ'' مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال''، اور حمید نظامی و مجیب نظامی کے ''نوائے وقت'' کو حاصل ہے، ان کا بال برابر حصہ بھی متذکرہ مصلحت اندیش اور خوشامد پسند کاروباری اخبارات کو نصیب نہیں ہے۔ ان مفاد پرست مالکانِ اخبارات نے اپنے کاروبار تو چمکا لیے، کوٹھیاں بھی کھڑی کرلیں، جائیدادوں کے مالک بھی بن گئے، بنکوں میں سرمایہ بھی اکٹھا کرلیا لیکن خلقِ خدا کی زبان ان کی تعریف اور خیر خواہی میں دو جھوٹے بول ادا کرنے کو تیار نہیں۔ شاید عزت و وقار کا حصول ان صحافیوں کا مسئلہ تھا بھی نہیں۔ یہ ساری زندگی سرکار کے قصیدے پڑھنے میں اس درجہ مگن رہے کہ انھیں خلق خدا سے اپنی تعریف سننے کی حسرت رہی نہ فرصت۔ ممکن ہے وہ سوچتے ہوں کہ کھنکھناتے سکّوں کی آواز میں جو جل ترنگ ہے اور کڑکڑاتے نوٹوں کی مہک میں جو کشش ہے، وہ بات اس داد و تحسین میں کہاں جو قوم کا غم کھانے اور اس کے لیے قربانیاں دینے سے ہاتھ آتی ہے۔

ذکر میر صاحب کا تھا اور میں بھٹک گیا۔ لیکن میں موضوع سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ذکر میر صاحب کا ہو اور مصلحت، مفاد اور موقع پرستی۔ [چار میم] کا قصہ نہ چھڑے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔

میر صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے انٹرویو کے سلسلے میں ہوئی [یہ انٹرویو اس مضمون کے

ساتھ شامل اشاعت ہے] ان دنوں میں جامعہ کراچی میں شعبۂ صحافت میں ایم اے سال آخر کا طالب علم تھا۔ میرے دوست طارق محمود میاں نے ''عقاب'' کے نام سے ایک رسالہ نکال رکھا تھا، اس کے لیے میں صحافیوں کے انٹرویو کرتا تھا۔ میر صاحب سے پہلے میں فرہاد زیدی اور محمد صلاح الدین کے انٹرویو کر چکا تھا اور یہ انٹرویو میر صاحب کی نظروں سے گذر چکے تھے۔ چنانچہ مجھے ان سے وقت لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس انٹرویو میں میر صاحب کے بارے میں جو بات معلوم ہوئی، وہ یہ کہ وہ سیلف میڈ انسان ہیں، منھ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے جو کچھ بنایا ہے، اپنی بے پناہ محنت وجدوجہد سے بنایا ہے اور جو کچھ وہ بنا چکے ہیں اس کی ہر ممکن وہ حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ آزادیٔ صحافت، جمہوریت یا مارشل لاء، بنیادی حقوق، غربت وافلاس، ناخواندگی، صحت وتعلیم، علم وادب وغیرہ ان کے مسائل نہیں ہیں۔ وہ ایک ہوشیار، جہاندیدہ، زمانہ ساز، زمانہ شناس، کاروباری ذہن رکھنے والے آدمی ہیں۔ جنھوں نے شومئی قسمت سے صحافت کو اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ اگر وہ صحافت کو اپنا پیشہ نہ بھی بناتے اور کسی بھی کاروبار میں ہاتھ ڈال دیتے تو اتنے ہی کامیاب ثابت ہوتے۔ اس لیے کہ بے پناہ محنت، [ان کی محنت کے ضمن میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ایک دن میں ان کے پاس گیا تو وہ شدید زکام کے زیرِ اثر تھے۔ ناک آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ وہ چھینکوں پہ چھینکیں مار رہے تھے۔ میں نے ازراہِ ہمدردی کہا: میر صاحب! طبیعت ناساز تھی تو گھر پہ آرام کر لیتے۔ کہنے لگے: بھائی میں کوئی ملازم تو ہوں نہیں کہ چھٹی کی درخواست دے کر غائب ہوجاؤں۔ مجھے تو کام کرنا ہی ہے] صحیح منصوبہ بندی، وقت کی قدر وقیمت کا احساس اور اس کا درست استعمال، معاملہ فہمی، مراسم وتعلقات کا وسیع دائرہ اور سب سے بڑھ کر روپے پیسے سے ازلی وابدی محبت بلکہ عشق۔ یہ وہ باتیں تھیں جو انھیں کسی بھی کاروبار میں بام عروج تک پہنچانے کے لیے کافی تھیں۔ پھر انھوں نے بی کام کرنے کے بعد صحافت کا پیشہ کیوں اختیار کیا؟ اس سوال پر غور کرنا میرے موضوع میں شامل نہیں ہے لیکن یہ سوال ہے اہم۔ اس لیے کہ جس زمانے میں میر صاحب نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا ہے، اس زمانے میں بالعموم شاعر، ادیب، قلمکار یا قومی خدمت کا جذبہ وعزم رکھنے والے لوگ ہی کوچۂ صحافت میں قدم رکھتے تھے۔ میر صاحب نہ شاعر تھے اور نہ ادیب ودانشور۔ وہ قوم کی خدمت کا بھی کوئی دعویٰ نہیں رکھتے تھے نہ انگریزوں کی غلامی سے انھیں نفرت تھی اور نہ وہ قیام پاکستان ہی کے لیے پُرجوش تھے، قیام پاکستان کا مطالبہ جب مسلمانانِ ہند کے دلوں کی آواز بن گیا تو جنگ نے بھی اس کی حمایت شروع کردی۔ دہلی کے حوض قاضی کے تھانے کے لاک اپ میں میر صاحب نے ایک رات بھی گزاری لیکن کس الزام کے تحت اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔ میر صاحب نے دہلی ہی میں اخبار سے وابستہ رہتے ہوئے ترجمہ، خبرنگاری اور زودنویسی وغیرہ پر پوری دسترس حاصل کر لی تھی۔ وہ جنگ کے لیے کبھی کبھار اداریے بھی لکھا

کرتے تھے۔علاوہ ازیں وہ اچھی تحریروں کے پارکھ بھی تھے۔اور خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ کوئی تحریر اپنی ادبیت اور چاشنی کے باوصف پڑھنے والوں میں مقبول ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں۔دوران انٹرویو میں نے انھیں منکسر المزاج انسان پایا۔میرے بعض سوالات تلخ تھے لیکن انھوں نے ہر سوال کا جواب تحمل و بردباری سے دیا، وہ اپنا ماضی نہیں بھولے تھے۔انھوں نے محجوب ہوئے بغیر ان دنوں کا ذکر کیا، جب وہ دفتر میں آ کر جھاڑو دیا کرتے تھے، میز صاف کرتے تھے اور کبھی کبھار سائیکل پر اخبار رکھ کر بیچنے بھی نکل جاتے تھے۔یہ بتاتے بتاتے وہ رُکے اور کہنے لگے: آج میں ایک کروڑ کا کاغذ خرید سکتا ہوں۔خداوند تعالیٰ کی سنّت ہے کہ وہ کسی محنت کو رائیگاں جانے نہیں دیتا۔بندہ جس مقصد کے لیے خون پسینہ ایک کرتا ہے، اس مقصد کو وہ پا کر رہتا ہے۔میر صاحب نے کروڑوں کی تمّنا کی تھی اور اس کی تکمیل کے لیے اپنی راتیں کالی کی تھیں۔سو انھیں ان کی منزل مل گئی تھی۔انھوں نے کئی گھنٹے پر محیط گفتگو میں ایک مرتبہ بھی قوم و ملک کا، اس کی خدمت کا کوئی دعویٰ یا تذکرہ نہیں کیا۔غالباً وہ اپنے ذہن وضمیر میں قوم کا کوئی تصور رکھتے ہی نہیں تھے۔جب میں نے انھیں ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا سبق یاد دلایا تو نہایت سادگی سے بولے میرے ادارے میں اتنے سو ملازمین کام کرتے ہیں کیا میں حکومت سے لڑائی مول لے کر انھیں بے روزگار کر دوں؟ ملازمین کا ذکر تو انھوں نے برائے بیت کیا، اصل میں وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ جو کچھ میں نے خون پسینے کی گاڑھی کمائی سے بنایا ہے، اسے ایک مجہول سچائی کے لیے داؤ پر لگا دوں۔لیکن انھوں نے یہ کہا نہیں۔لیکن میں نے اس کا یہی مفہوم نکالا۔ان کا دفتر سادہ سا تھا۔کرّ وفر کے کوئی آثار میز، کرسیوں اور در و دیوار سے ہویدا نہیں تھے۔وہ فضول خرچ نہیں تھے۔وہ کفایت شعار بھی نہیں تھے۔ہاں وہ کنجوس تھے۔پیسہ ان کی پہلی اور آخری کمزوری تھی بلکہ ان کی ساری کمزوریوں کی جڑ تھی۔جیسا کہ میرے آئندہ کے بیان سے معلوم ہوگا۔

''عقاب'' اور مجیب الرحمان شامی کے ''باد بان'' سے ہوتا ہوا میں محمد صلاح الدین کے ''جسارت'' سے وابستہ ہوگیا۔اور پھر جب استاد محترم متین الرحمان مرتضیٰ کے ایک اداریے پر منتظم اعلیٰ جناب محمود اعظم فاروقی نے انھیں برطرف کیا اور اداریے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے محمد صلاح الدین نے استعفیٰ دے دیا اور یہ استعفیٰ قبول کر لیا گیا تو میں نے بھی جسارت کی نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔بے روزگاری کے دن تھے۔جمیل الدین عالی صاحب سے جسارت کے دنوں ہی میں نیاز مندی پیدا ہوئی تھی انھوں نے مجھے کالم نگاری کے لیے ''جنگ'' میں میر صاحب کے پاس بھیج دیا۔میں جسارت، میں لکھے ہوئے کالموں کا پلندہ اٹھائے ان کے پاس پہنچ گیا۔وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے پہلی مرتبہ مل رہے ہوں۔حالانکہ مجھے ان کے ادارے کے لوگوں نے بتایا تھا کہ انٹرویو، چھپنے کے بعد رسالے کی کئی کاپیاں انھوں نے ادارے کے خاص

خاص افراد کو بھجوائی تھیں۔ انھوں نے اجنبیوں کی طرح مجھے دیکھا اور کہا: ''میاں! جنگ میں لوگ لکھتے رہتے ہیں تم بھی اپنا لکھنے کا شوق پورا کرلو''۔ انھوں نے مجھے نو آموز، نومشق کالم نگار کی طرح برتا۔ حالانکہ میں چار سال سے ''جسارت'' کے ادارتی صفحے پر پابندی سے چھپ رہا تھا اور میر صاحب جو چٹھڑے اخبارات تک پڑھنے کے عادی تھے، یہ کیسے ممکن تھا کہ ''جسارت'' کا ادارتی صفحہ نہ دیکھتے ہوں اور اس کے ایک مستقل کالم نگار سے ناواقف ہوں۔ انھوں نے ''جسارت'' میں چھپے ہوئے کالموں کو دیکھنا بھی پسند نہ کیا۔ یہ سب کاروباری ہتھکنڈے تھے اور یہ جتلانا مقصود تھا کہ ''جنگ'' میں لکھنا میری ضرورت ہے، ان کی نہیں اور یہ کہ جو کچھ میں لکھوں گا، اس کے معاوضے کا میں کوئی مطالبہ نہ کروں۔ میں خاموشی سے چلا آیا۔ ہر کالم نگار کی طرح ''جنگ'' میں چھپنے اور قارئین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچنے کا میں بھی آرزومند تھا۔ لہٰذا میر صاحب کے اس بے اعتنائی کے سلوک کو میں نے گوارا کیا۔ دو ایک دن کے بعد میں ان کے دفتر میں دو کالم لکھ کر دے آیا۔ شام ڈھلے ان کالموں کی قسمت معلوم کرنے کے لیے میر صاحب کو فون کیا۔ میرا نام سنتے ہی ریسیور پر ان کی آواز پُر جوش ہوگئی۔ ''میں آپ ہی کے فون کا انتظار کررہا تھا، مجھے فوراً اپنے کالم کا مستقل عنوان بتایئے''۔ میں نے عرض کیا: ''جسارت'' میں، میں ''دام خیال'' کے عنوان سے لکھا کرتا تھا۔ وہی رکھ دیجیے''۔

''نہیں، نہیں، جسارت کا عنوان مناسب نہیں رہے گا۔ کوئی نیا عنوان بتایئے''۔ انھوں نے بہ عجلت تمام کہا۔

''میں کل آپ کو نیا عنوان بتادوں گا'' میں نے کہا۔

''نہیں، کل تو یہ کالم پرانا ہوجائے گا، آج ہی ابھی تھوڑی دیر میں بتایئے''۔ یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس دن کے اخبار میں خبر چھپی تھی کہ کتوں کے مقابلۂ دوڑ میں جے اے رحیم کی کُتیا اوّل آ گئی۔ میرا کالم اسی موضوع پر تھا۔ اس واقعے میں دو باتیں نوٹ کرنے والی تھیں۔ میر صاحب نے دونوں کالم خود پڑھے، حالانکہ وہ انتہائی مصروف آدمی تھے اور یہ کام وہ ایڈیٹر محمود احمد مدنی صاحب سے بھی لے سکتے تھے۔ کالم کی زمانی اہمیت سے وہ واقف تھے اور اس کی اشاعت کے لیے وہ ایک دن کے توقف کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ میں نے دوسرے اخبارات میں بھی لکھا ہے، جہاں میرے کالم موضوعاتی اہمیت رکھنے کے باوجود کئی کئی دن بعد شایع ہوتے ہیں۔ یہ فرق ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' میں اس زمانے میں بھی تھا جبکہ وہ باہم حریف اخبار تھے۔ اخبار میں میر صاحب کی ذاتی دل چسپی اور قارئین کو تازہ ترین خبروں اور تبصروں کی فراہمی ''جنگ'' کی کامیابی کے دیگر بہت سے رازوں میں ایک راز یہ بھی تھا، بہرکیف، میں نے فوراً مشفق خواجہ

صاحب کوفون کر کے ان سے کالم کے عنوان کی فرمائش کی۔ وہ عنوانات اور کتابوں کے نام رکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فوراً کئی عنوانات بتائے جس میں مجھے ''برگردن راوی'' کا عنوان پسند آیا۔ میں نے دوبارہ میر صاحب کوفون کیا۔ انھوں نے کہا: ''آپ یہ عنوان مدنی صاحب کوفون کر کے بتادیں۔ ان کا فون نمبر یہ ہے''۔

''جنگ'' میں میرے پہلے دو کالم شہری صفحے پر شایع ہوئے۔ تیسرا کالم ادارتی صفحے کے بالکل اوپری حصے میں نمایاں طریقے سے شایع کیا گیا۔ ایک دن کالم دینے گیا تو مدنی صاحب نے بتایا کہ ''میر صاحب سے ملتے ہوئے جایئے گا۔ انھوں نے یاد فرمایا ہے''۔

میں نے پوچھا: ''خیریت تو ہے؟'' کہنے لگے: ''ہاں غالباً کچھ معاوضے وغیرہ کی بات کریں گے''۔ میں نے کہا: ''اگر پوچھیں تو کیا بتاؤں''۔ فرمایا: ''تین ہزار کہیے گا تو دو ہزار دینے پر آمادہ ہو جائیں گے''۔

میں نے یہ مشورہ گرہ میں باندھ لیا اور میر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حسبِ معمول کسی کام میں مصروف تھے۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کاغذات کو اُلٹتے پلٹتے ہوئے بے نیازی سے کہا: ''میاں۔ آپ کے کالم چھپ رہے ہیں تو کوئی نہ کوئی معاوضہ تو آپ کو ملنا چاہیے مجھے تو اس کا تجربہ نہیں ہے کہ کیا دیتے ہیں تو آپ خود ہی بتادیں کہ کیا لیں گے''۔ ان کے اس تجاہل عارفانہ پر میں حیران رہ گیا۔ بڑی جرأت سے عرض کیا: ''میر صاحب! آپ اتنا بڑا ادارہ چلا رہے ہیں۔ اگر آپ کو نہیں معلوم کہ ایک کالم نگار کو کیا معاوضہ ملنا چاہیے تو مجھے بھلا کیسے معلوم ہوسکتا ہے''۔ یہ سن کر ذرا جھینپے۔ جلدی سے بولے: ''یہی کوئی ایک سب ایڈیٹر کی تنخواہ کے لگ بھگ ہم آپ کو دے دیں گے''۔ بدقسمتی سے مجھے سب ایڈیٹر کی تنخواہ معلوم نہ تھی اور نہ میں نے ان سے پوچھنا ضروری سمجھا۔ عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ ''جنگ'' سے مجھے اتنی رقم مل جائے کہ مجھے کچھ اور نہ کرنا پڑے۔ اور میں ذہنی یک سوئی کے ساتھ کالم نگاری پر محنت کرتا رہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے''۔ انھوں نے کہا: ''لیکن آپ لیں گے کیا؟''۔ ''تقریباً تین ہزار''، میں نے سادگی سے کہا۔ یہ کہنا تھا کہ جیسے کمرے میں بم کا دھماکہ ہوگیا۔ میر صاحب اُچھل پڑے۔

''کیا کہا، تین ہزار؟'' انھوں نے تقریباً چیخ کر کہا: ''تین ہزار، تین ہزار، تین ہزار'' وہ مسلسل دہرائے جارہے تھے۔ اس دوران وہ کبھی میز کی دراز کھولتے، بند کرتے، کبھی کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگتے، ''آپ نے تین ہزار مانگ لیا یعنی میں آپ کو تین ہزار دے دوں۔ میرے ادارے میں لوگ بیس بیس سال سے کام کررہے ہیں انھیں ڈیڑھ اور دو ہزار سے میں زیادہ نہیں دے رہا۔ آپ کو تین ہزار دینے کا مطلب ہے میں ان

سب کی تنخواہ میں اضافہ کروں''۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ۱۹۸۴ء کا ذکر ہے، جب تین ہزار کی رقم ایک معنی رکھتی تھی لیکن یہ اتنی بڑی رقم بھی نہیں تھی کہ ایک کروڑ کا کاغذ خریدنے کی استطاعت رکھنے والے میر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں۔ مجھے کچھ غصہ سا آ گیا۔ میں نے عرض کیا:

''میر صاحب! آپ جنگ لاہور میں عبدالقادر حسن صاحب کو گیارہ ہزار روپے دے رہے ہیں۔ میں نے تو صرف تین ہزار مانگے ہیں''۔

''بہت اچھے۔ عبدالقادر حسن کو گیارہ ہزار روپے دے رہا ہوں تو آپ کو تین ہزار دے دوں۔ اور یہ بات آپ کو کس نے بتائی، ذرا مجھے اس کا نام تو بتایئے''۔

میر صاحب پر کچھ ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں حالت اضطراب میں انگلیوں میں موٹر سائیکل کی چابی گھمانے لگا۔ ان کی نظر پڑ گئی۔ بوکھلا کر پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' گھبرا کر جواب دیا: ''یہ چابی ہے؟'' فوراً پوچھا: ''کس کی؟'' عرض کیا: ''موٹر سائیکل کی''۔

اُن کا رُکا ہوا سانس بحال ہوگیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ گاڑی کی چابی نہیں تھی۔ ورنہ وہ جانے کیا سمجھتے، اس مجادلے سے میں تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے بحث کو ختم کرنے کے لیے میں نے کہا: ''میر صاحب! آپ جتنا جی چاہے دیجیے، مجھے تو لکھنے سے غرض ہے''۔

کہنے لگے: ''نہیں جناب، اب تو اس پر بات ہوگی، آپ نے تین ہزار مانگ لیے ہیں''۔ وہ مجھے برابر جھنجھوڑے جا رہے تھے اور میں شدید اعصابی دباؤ میں آ گیا تھا۔ اس لیے بحث کو کسی نتیجے تک پہنچائے بغیر اٹھ گیا: اس کے بعد ان سے دو ایک ملاقاتیں اور بھی ہوئیں لیکن ان کی تین ہزار کی رٹ جاری رہی اور معاوضے کا معاملہ معلق ہی رہا، لکھتے ہوئے ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزرا ہی تھا کہ ایک اور حادثہ پیش آ گیا، حادثہ اس لیے کہ خدا جانتا ہے کہ اس میں میری کسی شعوری کوشش یا سازش کا دخل نہ تھا۔ میں اگر سازش کرنا جانتا تو میر صاحب کو شیشے میں اتار چکا ہوتا۔ ہوا یوں کہ ایک دن مدنی صاحب کو کالم دینے گیا تو انھوں نے اطلاع دی کہ میر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ کچھ ناراض سے ہیں۔ آپ کے کسی کالم پر کچھ فون آ گئے ہیں۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا مگر یاد نہیں آیا کہ کس کالم پر فون آ سکتے ہیں۔ بہر کیف، حاضر خدمت ہوا۔ میر صاحب خلاف معمول سنجیدہ اور خاموش سے تھے۔ چہرے پر تناؤ تھا۔ بیٹھنے کے لیے کہا۔ بیٹھ گیا تو پوچھا: ''آپ نے آج کا نوائے وقت پڑھا ہے؟ میں نے کہا: ''جی نہیں''۔

انھوں نے نوائے وقت کا شمارہ اپنے سامنے سے اٹھا کر میرے سامنے ڈال دیا۔ باکس میں خبر

لگی ہوئی تھی جس کی سرخی کچھ اس قسم کی تھی کہ ''میر خلیل الرحمٰن جنگ اخبار کا ایڈیٹر جماعت اسلامی کے محمود اعظم فاروقی کو بنادیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی''۔ اصل میں ایک دن قبل میں نے ایک سیاست دان کی فرضی ڈائری اپنے کالم میں شایع کی تھی۔ میرا اشارہ پیر پگارا کی طرف تھا۔ ایک دن کے معمول میں درج تھا: ''میری ملاقات آج مولانا شاہ نورانی سے ہوئی میں نے ان سے جماعت اسلامی کی غیبت کی تو مولانا بہت خوش ہوئے اور مجھے پان کی گلوری پیش کی''۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنرل ضیاء الحق کی حمایت کرنے کی وجہ سے مولانا نورانی جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد سے بہت خفا تھے۔ چنانچہ اگلے دن مولانا نورانی نے کالم کے ان فقروں پر شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا۔ چونکہ میں ''جسارت'' میں بھی مولانا کی چٹکیاں لیتا رہتا تھا لہٰذا انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ اب ''جنگ'' میں بھی ان کے خلاف محاذ کھل گیا۔ چنانچہ انھوں نے پریس کانفرنس میں میر صاحب کو خوب لتاڑا۔ الیاس شاکر جو ان دنوں نوائے وقت سے بہ حیثیت رپورٹر وابستہ تھے، اور غالباً میری ''جنگ'' سے وابستگی ان کے لیے پسندیدہ نہیں تھی اور پھر یہ کہ نوائے وقت، کراچی میں جنگ کا حریف بھی تھا۔ لہٰذا مولانا کے بیان کو صفحہ اول پر جگہ مل گئی۔ میں نے اخبار پڑھ کر ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ: ''مجھے افسوس ہے.....'' میر صاحب چیخ پڑے: ''میاں! آپ نے مجھے تباہ کردیا۔ مجھے برباد کردیا۔ میاں! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس اخبار کو اپنی جوانی دی ہے۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی، کبھی جوا نہیں کھیلا، کبھی کوٹھے پر نہیں گیا۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس اخبار کو دیا ہے۔ لیکن آپ نے مجھے تباہ کردیا۔ آج میں برباد ہوگیا''۔ انھیں اتنا پریشان حال اور دل گرفتہ پاکر میں نے عرض کیا: ''میر صاحب! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کے اخبار کو نقصان پہنچایا ہے تو میں آپ سے اجازت لیتا ہوں''۔ وہ کہنے لگے: ''نہیں، نہیں اس کا تو مطلب ہوگا کہ میں اس بڈھے سے ڈر گیا۔ میں تو اس کی داڑھی نوچ لوں گا۔ لیکن میاں! آپ نے بھی کام دکھادیا''۔

''کیسا کام میر صاحب؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''یہی کام۔ آخر آپ نے مولانا نورانی ہی کے خلاف کیوں لکھا، پروفیسر غفور کے خلاف کیوں نہیں لکھا''۔ میں نے کہا: ''ان کے خلاف بھی لکھ دوں گا، میرا تعلق کسی پارٹی سے تو ہے نہیں، جس میں کوئی قابل ذکر بات دیکھوں گا اس کا ذکر کروں گا۔ ایک ساتھ سب کا ذکر تو ممکن بھی نہیں ہے''۔

''نہیں نہیں آپ نے کام دکھایا ہے''۔ انھوں نے اصرار کیا۔ میں نے مزید ذہنی تشنج میں انھیں مبتلا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے انھوں نے کالم جاری رکھنے کی تلقین کی۔ لیکن اس کے بعد میں نے جو کالم دیے، وہ شایع نہیں ہوئے۔ کیوں شایع نہیں ہوئے، یہ جاننے کے لیے میں پھر ان کی خدمت

میں حاضر ہوا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی پنسل سے جسے صرف چٹکیوں سے پکڑا جا سکتا تھا، کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے سر اٹھا کر دیکھا اور ہنس کر کہنے لگے: ''آپ کو دیکھتے ہی ساری پریشانی دُور ہوگئی''۔ غالباً اس فقرے میں طنز تھا، جسے میں اس وقت محسوس نہ کر سکا۔ بات چیت شروع ہوئی تو میں نے کالم نہ چھپنے کا سبب پوچھا۔ حالانکہ سبب تو ہم دونوں کو معلوم تھا لیکن میں نے کالم نگاری کا سلسلہ ان کی ہدایت پر منقطع نہیں کیا تھا۔ اس لیے سبب جاننے کا مجھے حق تھا۔ کہنے لگے: ''بھئی آپ کے کالم میں کاٹ نہیں ہے''۔

عرض کیا: میر صاحب! ایک کالم کی کاٹ ہی کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ اب آپ اور کتنی کاٹ چاہتے ہیں''۔ جھینپ کر بولے: ''میاں! میں چھپ کر لوگوں کی رائے تو سنتا نہیں کہ وہ آپ کے کالم کے بارے میں کیا کہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بہت پسند نہیں کیے جا رہے ہیں''۔

میں نے کہا: ''میر صاحب! میں کالم نگار ہوں اور اتنا تو جانتا ہی ہوں کہ میں کیسا لکھتا ہوں''۔

جلدی سے بولے: ''نہیں، نہیں آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کا انداز تحریر بہت اچھا ہے، میں آپ کو ایک آفر کرتا ہوں، آپ ہمارے ہاں اداریہ لکھیں''۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب اپنے اخبار میں میرا نام شایع کرنا نہیں چاہتے۔ میں نے معذرت کی کہ یہ میرا میدان نہیں ہے۔ اور پھر میں اٹھ کھڑا۔ مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی میر صاحب نے وضو کرنے کے لیے آستینیں چڑھائیں، میز سے نکل کر میرے نزدیک آئے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا: ''دیکھیے میرے اور آپ کے درمیان کوئی معاوضہ تو طے ہوا نہیں تھا۔ اس لیے میں آپ کو کوئی معاوضہ تو نہیں دے سکتا۔ البتہ آپ کے جانے کا مجھے افسوس رہے گا''۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ ذہن میں خلجان رہا کہ آیا کالم نہ چھاپنے کا سبب مولانا نورانی والا واقعہ ہے یا میری خراب کالم نگاری چنانچہ بہت دنوں بعد، جب اس واقعے پر وقت کی دھول جم گئی۔ عبدالقادر حسن ''امروز'' کے ایڈیٹر بنا دیے گئے اور ''جنگ'' سے وقتی طور پر ان کا کالمانہ تعلق ختم ہوگیا۔ تو میں نے میر صاحب کو ایک خط لکھا کہ عبدالقادر حسن کی رخصتی کے بعد اگر آپ کو میری خدمات کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ چند دنوں کے بعد ان کے سیکریٹری کا فون موصول ہوا کہ میر صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ شوق سے کالم لکھیں لیکن خیال رہے کہ پہلے جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آ جائے۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ میں ان کے نزدیک خراب کالم نگار نہ تھا!۔